

آصف رضا

سات بہنیں

ایک مرجانی جزیرے پر عریض
سات بہنیں، شب خرامی کی مریض
صبح دم، خواب شہانہ کے تعاقب میں دواں
ایک سنگِ سرخ کو اپنا بنا کر دید باں
جائزہ پر شوق لیتی ہیں خلائے بحر کا...
پھیلتا ہے جھاگ ساحل پر پلٹتی لہر کا

قد کشیدہ، سات بہنوں کے سنہرے بال ہیں
کپکپاتے باکرہ لب لال ہیں
تبغ جیسا ابروؤں کا ان کی محرابی ہے خم...
موجزن سینوں میں اک طوفان ہے ناختم
حد فاصل کھینچتی دہلیز آب
ایستادہ، دیکھتی رہتی ہیں خواب،

کوندتی ہے ان کی آنکھوں میں جواہر کی چمک...
شاہراہ آب لیکن بے لچک
دیکھتی ہیں وہ کہنا آباد ہے، تصویر یاس،
دور افتادہ افق پر بادباں کا التباس!
مٹھیوں سے ان کی گرتے ہیں سمندر کے عقیق

قعر لیتا ہے جنہیں واپس، عین

بربطِ زریں اٹھا کر ہفت تار
چھیڑتی ہیں وہ طلائی شاہکار
گوشتِ ان کی سواحل پر صداست سرگی...
نیلگوں چوٹی پہ اپنی بادخیزاں ہے تھی
سن کے ان کا گیت استمرار میں
بے صدا آبی جس ہے غار میں

باز گشتانہ ہے ان کے پُرغنا پیغام میں
آبِ نقرہ دار کا وعدہ، طلائی جام میں
لحہ اقبال کا مژدہ (بطور ارمغان
پیش کرتا ہے صدف منھ ڈھانپ کر لعلِ گراں)
ایڑیاں ان کی گلابی چوم کر جل کی تیں
برہمی کھوتے ہوئے اپنی تھمیں

ایک زیریں رو کے استفسار پر
سرنگوں ہو کر چٹختی ہے چٹانوں کی مگر
ورطہ مجہول کی ناواقفی
پیچ آبی کھول کے کرتا ہوا اپنی نفی
منہمک بالذات اک اتلاف میں ہے مبتلا
صبح، سطحِ آب کو دیتی ہوئی رنگِ طلا

نیلگوں گہرائیاں ہیں ان کی آنکھوں کی آتہ

طیغ غلطاں جن میں لیتے ہیں پناہ
نقرئی شاخوں کے زیریں سبب سینے پر دھرے
دیکھتی رہتی ہیں گہرے کے پرے
ساحلِ دہشت سے ملاحوں کا لیکن احتراز
آبنائے بحر میں داخل نہیں کوئی جہاز

سمتِ منزل ہے خموشی سے رواں
تاجروں کا کارِ برداری سے بوجھل کارواں
ہاتھ ماتھوں پر ٹکائے، راہِ گوش
کالبدِ مستول پر ہیں، تیز چشم و تیز گوش
زیر لب سرگوشیوں میں ذکرِ بندرگاہ ہے
پیش میں روحِ عمل ہے... استراحت خواہ ہے

مہمان

آہ! یہ کس وضع کی دعوت ہے جس میں اجنبی
آ رہے ہیں زیب تن کر کے لبادے ماتمی
نامناسب نیم شب کے باوجود
ایک بے آواز رُو میں جن کا جاری ہے ورود؟

ان کے بشرے صاف دیتے ہیں سراغ
اک معزز خانوادے کے ہیں یہ چشم و چراغ
چھٹ کے دیتے ہیں گزرنے کا ادب سے راستہ
فرش سے شہتیر تک جالے تنے زربافتہ

حافظے میں ہے تعلق استوار
 ان کا اس بیٹاق سے جس کے مطابق برج دار
 مرمریں ایک قصر تھا ان کے لیے آغوش وا
 منعقد ہونا تھا جس میں ان کے استقبال کا
 جشن، لیکن خیر مقدم ان کا کرتا ہے کھنڈر
 ہیں شناسا ان سے اس کے منہدم دیوار و در؟

خوگرفتہ آہ یہ مہماں ہیں اس تقریب کے؟
 سحر میں جیسے کسی ترغیب کے
 دائرے میں بیٹھتے جاتے ہیں آکر، سرنگوں
 روح کو حاصل نہیں ان کی سکوں
 زانوؤں پہ ہیں دھری دکھتی ہوئی پیشانیاں
 پھر نہیں حاضر پذیرائی کو ان کی میزباں!

لاپتا ہیں خوب رو، کم سن غلام
 غیر حاضر ہیں، بجالاتی نہیں جھک کر سلام
 حوروش کم سن کنیزیں، خوان مہمانی نہیں
 جس پہ ہونی چاہیے تھیں نعمتیں جملہ چنی
 شیر ہے، انگور ہیں، نہ انگلیں
 دھول ان کو پیش کرتا ہے فقط فرش زمیں

موت کے نسیان سے محروم یہ پرچھائیاں
 چوکتی ہیں جب خروں صبح دیتا ہے اذال

اپنے پھیلاتی ہیں بازو، (جیسے طائر اپنے پر)
دور افتادہ ہے ان کا مستقر!

موسم

یہ وہ موسم ہے کہ جس میں شاخ پر کھلتے نہیں
پھول آپس میں گلے ملتے نہیں
اجنبی پیمان کر کے راہ کا
یہ نہیں موسم سفر کی چاہ کا

یہ وہ موسم ہے کہ جس میں فصل اپنی کاشتہ
مطمئن حاصل سے اپنے یا کہ دل برداشتہ
کھیت سے اپنے اٹھاتا ہے کساں
بچ بونے کا زمانہ یہ کہاں!

کر چکا گردش مکمل دائرہ ایام کا
ہر شجر ہے بار اٹھائے پشت پر اپنی جھکا
اور اپنے ہر ثمر کو شاخ کرتی ہے شمار —
رانندہ ہستی ہے وہ جو آج بھی ہے فرض دار

پھول کہ جن کے نصیب میں تھا کھلنا کھل چکے
جن کی قسمت میں گلے ملنا تھا بڑھ کر مل چکے
ڈھونڈتے تھے جو وطن اپنا، دیار

ہو سکے تو، ہو چکے منزل سے اپنی ہم کنار

وہ کہ جس کا آج منس نہ کوئی غم خوار ہے
آہ! اس کی عجلت رفتار اب بے کار ہے
اب نہ ہوگی اس کو لذت خواب شیریں کی نصیب
اس کی راتوں کو نہ گرمائے گی آغوش حبیب

پیٹھ پر جولا دتا ہے آج سامان سفر
اس کا یہ مقصوم ہوگا کہ پھرے گا عمر بھر
ٹھوکریں کھاتا نہیں کھولے گا کوئی اپنا در
اس سے کترائے گا ہر فرد بشر

سینہ ترا...

سینہ ترا اک گوشہ مامون ہے اُس باغ کا
سایہ نہیں جس پر عملدار نہ گرداں زارغ کا
اوندھی زمیں جس کی نہیں ہے، اپنی شادابی سے تنگ
چلتی ہے جس میں جب ہوا — اڑتا نہیں پتوں کا رنگ

سر سبز چوبِ نخل وابستہ نہیں تابوت سے
دہشت زدہ جس میں نہیں ہے شاخ اپنے بھوت سے
ممتا سے جس میں پالنا ایسے جھلاتی ہے صبا —
خورشید ہوتا ہے درخشاں صبح استقبال کا

گرداں فضائے نیلگوں میں ہے بھنور
آمینہ رنگوں کا جس میں چرخ کھاتی ہے سحر
خواب گراں سے ہے کیاری میں غنودہ کو کنار
اور عشق پیچاں یا سمن سے ہم کنار

سایہ کنناں ہے تیرے رخساروں پہ اک زلف سیہ
جس میں گل احمر سجاتی ہے نبات آویز یہ
سینہ ہے کتنا گرم تیرا! جیسے برج آتش!
طاری تری آغوش میں ہے مجھ پہ طفلانہ غشی

سنتا ہوں کوئی لحن، جس سے اک ستارہ ٹر ملائے
اور کھینچ کر خط روشنی کا تیرگی میں ڈوب جائے —
مت چونک میرے حافظے کا یہ مگر ہڈیاں ہے
پینے دے ہونٹوں کا عرق — افسردہ نسیان ہے

آنکھوں کی تیری جھیل رکھتی ہے کھلے موسم کا رنگ
ہوتی ہے زندہ ڈوب کر جس میں مری مردہ امنگ
دل ہے سبک میرا تہی جیسے خریطہ زہر کا
ہر اک شگوفہ بلبلہ ہے — خرمی کی لہر کا!

حیطہ بدر پر چھائیاں لیکن نظر
آتی ہیں جب تو ماندگی سے میرا سر
بھاری ہٹاتی ہے تو چونکا تا ہے مجھ کو یہ خیال —
تاریک اپنے دل میں کیا ہنستے ہیں مجھ پر تیرے بال؟

درندہ

ستاروں کی سروں میں بولتا تھا جو پرندہ
شجر کے آشرم سے جا چکا کوئی درندہ
کھڑا پنوں پہ اب اپنے اُسے جھنجھوڑتا ہے
شمر، جو تلخ ہیں، چنگھاڑ کر بھنجوڑتا ہے

تنا، رس دودھیا کرتا تھا جو جھک کر فراہم،
کھڑا ہے بے لچک، جس طرح نفرت ہو مجسم،
رہا کرتا تھا آویزاں جہاں اک سرخ خوشہ —
نہیں آغوش وا، ہے زرد وہ شاداب گوشہ —

سزا کے طور پر نگلی صلابت مند شاخیں،
بجاسا کن ہیں، جیسے قید خانے کی سلاخیں،
ابد تک حافظے میں لجن کوئی اس کے زندہ —
اٹھا کر منہ فلک کی سمت روتا ہے درندہ!

خروج

افلاک پر
ترتیب ہے بگڑی ہوئی
اجرام کی

صلب سے جیسے
شگافِ کوہ سے کرتی نمود

پھیلائے پر
تمثیلیں سیاہ افکار کی

کوہ کی چوٹی
مثل سرِ پستان، نو کیلی
زیرِ نگیں ڈھلوان پر
علاماتِ مقدس ہیں گڑی
جست کرتا
غار سے کلبِ سیاہ

جنش میں دل دل کا شکم
کیچڑ سے آلودہ
اوج پر گاڑے قدم
نعرہ لگاتا ہے بہیمہ

قامت کی اونچی کاہنہ
اپنی گہری نیند میں خنداں
دانتوں سے آنول نال اپنی کاٹتی ہے
اور کوکھ سے کالا ولد
آزاد کر کے
تیرہ منطقے پر چھوڑتی ہے

منسوخ ہے فردا کا سورج
قطبین کے مابین

گوں جیتا ہے، رعد جیسے
اہرمن کا قہقہہ

دریا

کس کی دریا بردشتی سے ہے پیدا یہ بھنور؟

چھوڑا ہے کس نے
دستخط کی طرح سطح آب پر

اپنا نشان —

ٹوٹے ہوئے مستول سے

چٹا ہوا یہ بادباں؟

وہ کون کشتی بان تھا شوریدہ سر

یہ جاننے کے باوجود

کہ نہیں ہیں دوست دار

موج دہوا

تقدیر اس کی ہو چکی ہے

لوح اسود پر رقم

(دیکھتا تھا دیدہ انجام ہیں

سرخیز اک موج ہلاکت آفریں)

اس نے کیا قصد سفر

گردن اٹھا کر اپنی اک شدہ زور موج

ہاتھ سے اپنے مٹاتی ہے نشان —

ٹوٹے ہوئے مستول سے

چٹا ہوا اک بادباں

بے داغ سطح آب زار
بڑھتا ہے آگے کی طرف
دریا، ابد کا ہم جوار

جھیل

کالی چٹانوں پر کھڑے
دیتے ہیں پہرہ
دیو قامت دیودار
روپوش رکھتا ہے اسے
سورج کی نظروں سے
حصار کو ہسار

کروٹیں لیتا ہوا سینے پر اس کے
صبح و شام
کھرہ دبیز
کرتا ہے اس پر آشکار
افراز شب کا درخشاں

اونچے صنوبر
اس کے بازو ہیں دراز
سمتِ فلک —

پھیلی ہوئی آغوش—
دور ہے لیکن پہنچ سے ماہتاب
بند کمرہ اپنا کرتا ہے شگاف

محبوس وہ زندان تیرہ میں
مگر اس کی متاع
ایک پل کو آسینے میں اپنے باطن کے
قمر کا انعکاس

ملاپ
سرخ لاوے کا، سمندر ساختہ
اک جزیرہ تھا وہ، نادر یافتہ
جس کے بیچوں بیچ تھی
شعلے لگتی اک دراڑ
وہ جس کے پار
میرا ازل سے کر رہی تھی انتظار

اس کے سر پر تھا درخشاں
ہالہ مریم کا نور
وہ کھڑی تھی خود سپردہ
پڑھ گشت و پڑغور
حور پیکر باکرہ میری، سیاہ
اس کی آنکھوں میں تھی ترغیب گناہ

میں نے پہچانا اسے
اور اس نے پہچانا مجھے
بیقرارانہ بڑھے اور لگ گئے دونوں گلے

گر رہی تھی عرش سے پیہم ہمارے سر پہ دھول
ہو رہا تھا آسمانوں سے فرشتوں کا نزول